© rasailojaraid.com

پیچیدہ اور مشکل سوال لے کر آئے جن کو پوری Intensity اور شدت کے ساتھ مسلم روایتی ذہن کے سامنے رکھنے میں ڈاکٹر سعدیہ یعقوب، پروفیسر جیر الڈ مکینی، ڈاکٹر محمد یونس، پروفیسر اطالیہ عمیر، پروفیسر جیسن اے اسپر نگ اور مولانا عمار خان ناصر نے مختلف اسلوب وانداز میں حصہ ڈالا۔ ان حضرات نے اسلامک فیمنزم اور روایتی فقہی فکر کے حوالہ سے اسلام میں حقوقِ نسواں کی بحث، بایو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے پیدا کردہ مسائل اور ابراہیمی مذاہب؛ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کا موقف، آزادیٔ نسواں اور یہودی روایتی موقف کی تفہیم کرائی نیز اسلامی فلسفیانہ فکر (شعرانی اور ملا صدرا کے حوالہ سے) اور جدید ذہن کے اشکالات کا جائزہ لیا۔ پاکستان کے مولانا محمد عمار خاں ناصر نے بھی مسائل کی تفہیم میں وقتاً فوقتاً حصہ لیا اور اخیر کے دو دنوں میں جنوب ایشیا کی اسلامی فکر، شاہ ولی اللہ اور انور شاہ کشمیری وغیرہم کے خیالات وافکار کے جائزہ پر مبنی انہیں کے ساتھ خاص رہے۔ ان کے ساتھ ہی ہندوستانی مدرسہ ڈسکورس کے استاد و گائڈ مولانا ڈاکٹر وارث مظہری کو بھی لیکچر دینا تھے مگر بعض ضروری مجبوریوں کے تحت وہ ایک ہفتہ کی شمولیت کے بعد ہندوستان واپس ہو گئے اس لیے ان سے استفادہ سے شرکاء محروم رہے۔

اس انٹینسوِ میں تقریبا ۲۵ طلبہ پاکستان سے، ۱۹، انڈیا سے، ۵ جنوبی افریقہ سے تھے جبکہ نوٹرے ڈیم یونیورسٹی امریکہ سے سات طالبات شریک تھیں۔ انٹینسوِ کا شیڈول بہت ٹائٹ تھا۔ صبح نو بجے سے لیکچرز شروع ہوتے تو شام پانچ بجے تک چلتے، بیچ نماز اور کھانے کا وقفہ ہوتا۔ بعد مغرب کے Cosmos دکھائی جاتی اور اس کے بعد ڈنر۔ ساڑھے نو بجے رات کو دوسرے دن کی ریڈنگ کی تیاری کی جاتی۔ یاد رہے کہ اس انٹینسوِ کی تقریبا 400 صفحات پر مشتمل reading pack تمام شرکاء کو کوئی ایک ماہ پہلے سے فراہم کر دیا گیا تھا جسے سب کو پڑھ کر آنا تھا۔

طلبہ اور فیکلٹی کے قیام کا نظم ڈھولی خیل رزارٹ میں رکھا گیا تھا جو کاٹھمنڈو شہر سے ۴۰ کلو میٹر دور پہاڑی خطہ میں نہایت سرسبز وشاداب اور پُر فضا مقام ہے۔ نیپال پہاڑوں، وادیوں، جھرنوں اور قدرتی خوبصورت مناظر کے علاوہ ماؤنٹ ایورسٹ نیز دنیا کی کئی اور بڑی پہاڑی چوٹیوں کا دیس ہے، ڈھولی خیل بھی انہیں خاص مقاموں میں سے ایک ہے۔ دہلی کی شدید گرمی سے پندرہ دن تک کے لیے راحت مل گئی بلکہ مجھے تو یہاں قدرے سردی سی محسوس ہوتی۔ روزانہ رات کو بارش شروع ہو کر دن کے دوپہر تک ہوتی رہتی۔ موسم کے لحاظ سے سب لوگ گرم کپڑے وغیرہ لے کر آئے تھے۔ قیام کا نظام بہتر بنانے کی کوشش کی گئی تھی مگر ایک ہی کمرہ میں تین تین طلبہ کو رکھنا مناسب نہ تھا کہ اکثر مزاجوں کی ناموافقت اذیت کا باعث بن جایا کرتی ہے۔ ریفریشمنٹ اور کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا اور امریکن طرز طعام اور مشرقی کھانوں کا امتزاج تھا۔

یوں تو پورے انٹینسوِ میں زیادہ تر انگریزی ہی لیکچر اور سوال وجواب کی زبان رہی تاہم اردو میں بھی سوال وجواب کی گنجائش تھی جس کا علی الفور انگریزی ترجمہ پروفیسر ماہان مرزا اور کبھی کبھار پروفیسر ابراہیم موسیٰ کر دیا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے۔ البتہ اخیر کے دو دنوں میں مولانا عمار ناصر کی گفتگو اور سوال وجواب کی نشستوں میں اردو ہی اظہار مافی الضمیر کا وسیلہ بنی رہی۔

سمر انٹینسو کے پہلے تین دن ولیم کالج میں مذہب کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سعدیہ یعقوب نے فقہی متون (امام سرخسی) قدیم فقہی فتاوی اور فیصلوں کا تذکرہ کیا اور تقابل میں بتایا کہ مغربی دنیا میں متحرک اسلامی فیمنزم کی نمائندہ لکھنے والیاں کیشیا علی، آمنہ ودود اور حنا اعظم وغیرہ scriptural reasoning کو کس طرح برتتی ہیں یعنی وہ خواتین کے تعلق سے مذہبی متون کی ریڈنگ اور تشریح کیسے کرتی ہیں۔ اسلامی فیمنزم کا موقف اصل میں یہ ہے کہ مسلم معاشرہ بنیادی طور پر پدرسری معاشرہ ہے جس میں اسلامی دینیات کے مراجع قرآن، حدیث اور فقہی متون مرد کو عورت پر ملکیت کا حق (تملیک) دیتے ہیں۔ اس فیمنزم (جس کی ایک نمائندہ خود موصوفہ بھی تھیں) کا کہنا ہے کہ آج حالات بدل چکے ہیں اور نیشن اسٹیٹ کے اِس زمانہ میں جبکہ مرد وعورت دونوں کماتے ہیں ہم معاشرتی طور پر زرعی دور کے اس معاشرہ کی طرح نہیں سوچ سکتے جس میں مرد عورت پر ایک طرح کی ملکیت رکھتا تھا۔ ان کے مطابق فقہا کا مرد وعورت کے بارے میں بنیادی تصور ارسطاطالیسی ہے کہ عورت صنف نازک، ناقص العقل اور مرد صنف قوی ہے۔ آج یہ تصور ہی بنیادی طور پر تبدیل ہو چکا ہے اس لیے اس مفروضہ (Assumption) پر مبنی احکام پر نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ فقہ اسلامی کا غالب رجحان یہ ہے کہ عورت کا بنیادی وظیفہ شوہر کی جنسی خواہش کی تکمیل ہے اور بس۔ مگر پروگریسو مسلمان ان فقہی تصورات سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ایسی نئی فقہ ڈیولپ کرنے کے حق میں ہیں جو مرد وعورت کے درمیان مساویانہ رویہ رکھے۔

یہاں تملیک سے خود فقہاء کیا مراد لیتے ہیں اور اس تعبیر کی وہ خود کیا تشریح کرتے ہیں اس سے زیادہ بحث نہیں بلکہ مسلم معاشرہ عملاً نظریۂ تملیک کے نتیجہ میں جو رویہ خواتین کے ساتھ روا رکھتا آیا ہے اصلاً وہی مرکز توجہ بن گیا ہے۔ اس ضمن میں جدید مسلم مصنفین مثلاً مولانا مودودی وغیرہ جس طرح مرد وعورت کی اس عدم مساوات کو Justify کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کو فیمنزم کے علمبردار بددیانتی Apologetic اور فقہ کی غلط ترجمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس پر بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وللرجال علیہن درجة اور الرجال قوامون علی النساء جیسے قرآنی نصوص کی تفہیم پھر کس طرح ہو گی؟ فیمنزم والے کہتے ہیں کہ یہ دراصل قرآن کا کوئی ابدی حکم نہیں بلکہ نزول قرآن کے وقت انسانی معاشرے عورت کے بارے میں جو تصورات رکھتے تھے (خاص کر عرب پس منظر میں) قرآن نے اس کو بس ویسے ہی بیان کر دیا ہے۔ آج ان نصوص کی نئی تفہیم درکار ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ معجزات کی بحث اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی پیدائش وموت وغیرہ بحثوں پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے بھی اپنی تفسیر میں جا بجا اِس طرف اشارے کیے ہیں۔

میرے کمرے کے ایک پاکستانی ساتھی بہت سوتے تھے۔ میں نے مزاحاً ان کو کہا کہ اتنا کیوں سوتے ہیں؟



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہنے لگے کہ دنیا میں نیند سے زیادہ مرغوب چیز کوئی نہیں۔ اگر ۱۲ گھنٹے نہ سوؤں تو مزہ نہیں آتا۔ راقم کے منہ سے برجستہ نکل گیا، جب اتنا ہی سونا تھا تو پاکستان کیوں بنایا تھا! وہ بھی کہاں چوکنے والے تھے۔ بولے، پاکستان تو بقول شخصے علی گڑھ کے لونڈوں کی شرارت تھی۔ ان کے بے ساختہ جواب پر قہقہہ پڑا۔ راقم آج کل علی گڑھ میں برسرکار ہے، اس لیے تلمیح کاٹ دار تھی۔

اگلے دو دن پروفیسر ابراہیم موسیٰ اور ان کے شاگرد دکتور محمد یونس کی گفتگوئیں رہیں جن کا موضوع امام عبدالوہاب شعرانی کی ارشاد الطالبین اور ملا صدرا کا فلسفہ رہا۔ شعرانی محی الدین ابن عربی کے شاگرد ہیں۔ ان کی کتاب میں القلم الاعلی، الواح المحو والاثبات، اسباب الخیر، سعادت کا حصول حقیقیت محمدیہ جیسی پیچیدہ بحثوں پر بات ہوئی۔ شعرانی کا خیال ہے کہ القلم الاعلی جو لکھ دیتا ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا مگر اس کے علاوہ 360 اقلام ہیں جو الواح المحو والاثبات میں لکھتے رہتے ہیں۔ ان میں کمی زیادتی اور حذف واضافہ ممکن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو سفر معراج میں ان ہی اقلام کی آواز (صریف الاقلام یا صریر الاقلام) سنائی دی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ شعرانی کی imagination ہے۔ تاہم میرے خیال میں شعرانی یہ جو کہتے ہیں کہ علم کا حتمی اور Ultimate سورس اللہ تعالیٰ ہے جو دو ذریعوں سے انسانوں کو علم دیتا ہے: وحی کے ذریعہ اور بذریعہ الہام والقاء۔ پہلے ذریعہ علم سے سیاست شرعیہ وجود میں آتی ہے جبکہ الہام والقاء کے ذریعہ سیاست حکمیہ۔ سیاست حکمیہ پہلے ہوتی ہے سیاست شرعیہ اس میں اصلاح پیدا کرتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسانی تجربات، تہذیبی اقدار اور مبنی بر عقل نظریات و آراء اور محسوسات بھی خدا ہی کی طرف سے ہوتے ہیں لہذا سیکولر علوم و نظریات سے بھی بایں طور استفادہ کرنا چاہیے کہ وہ بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ شعرانی کا یہ تصور علم قدیم وجدید کے قصہ کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ان کی باہمی معرکہ آرائی کو قصۂ کوتاہ قرار دیتا ہے۔ اس سے مذہب و سائنس یا عقل و نقل کے مابین تصادم کی ساری تھیوری بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تصوف اور Reason سے ہم آمیز شعرانی کے خیالات آج مذہب و سائنس کے تصادم کی بحث میں کام دیتے ہیں اور ان خیالات و افکار کو بھی معنی خیز بنا دیتے ہیں جو انسان نے اپنی عقل، حس، مشاہدہ اور تجربات سے اخذ کیے ہیں۔ بیسویں صدی کے سیاسی اسلام کے بعض علمبردار یا روایتی علما جس شدت سے سیکولر علوم کی مخالفت کرتے رہے ہیں ان کے بالمقابل شعرانی کے یہ خیالات حیرت انگیز تھے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں مفہمون یا اہل عقل و نظر کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا سب سے اعلی طبقہ وہ انبیاء کو قرار دیتے ہیں۔ اور فلاسفہ کو بھی مفہمون میں گردانتے ہیں۔ شعرانی اور شاہ ولی اللہ ان خیالات سے استفادہ کر کے سائنس و مذہب یا عقل و نقل کے مابین مفروضہ کشمکش کے خاتمہ یا کم از کم اس کی شدت میں کمی لانے کا کام کیا جا سکتا ہے۔

غالباً نٹینسو کے چوتھے دن کی شام راقم نے اپنے ساتھی مفتی سعد مشتاق صاحب کو ساتھ لیکر پاکستان کے ابھرتے نوجوان عالم و مفکر مولانا عمار خاں ناصر مدیر الشریعہ سے قریباً ایک گھنٹہ کی ملاقات کی اس ملاقات میں مختلف



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موضوعات زیر بحث آئے اور عمار خاں صاحب سے بہت سے سوالات بھی ہم لوگوں نے کیے اور استفادہ کیا۔

**بایو سائنس، نئی ٹیکنالوجی اور دینیات:** بایو سائنس، جینیٹک انجینئرنگ اور نئی ٹیکنالوجی نے جو ایجادات کی ہیں انہوں نے دینیاتی فکر کے لیے نئے چیلنج پیدا کر دیے ہیں۔ آج ارتقاء کو ایک سائنسی مسلمہ مانا جاتا ہے۔ انسانی کلوننگ کے عمل کے ذریعہ جیتا جاگتا مصنوعی انسان (Post human) یا New Human پیدا کرنے کی طرف آج کی سائنس بڑھ رہی ہے۔ مغرب میں کوشش ہو رہی ہے کہ انسان کو ابدی بنا دیا جائے۔ اُسے موت نہ آئے یا وہ ہمیشہ جوان رہے، یا کم از کم اس کی زندگی کا دورانیہ بے حد طویل کر دیا جائے۔ ایسی دوائیں بنائی جا رہی ہیں جن سے اس کے جذبات پر کنٹرول ہو جائے۔ مثلاً وہ جب چاہے خوش ہو جائے۔ وہ ناراض نہ ہو، اُسے اشتعال نہ آئے نہ کوئی رنج و غم محسوس ہو، وہ کبھی نہ اکتائے کبھی تکان محسوس نہ کرے۔ ایسے روبوٹ بنائے جا رہے ہیں جن میں ارادہ و شعور انسان کی طرح ہو۔ روبوٹک بیویوں کا تصور کبھی فکشن کی کتابوں میں ملتا تھا اب پورا ہونے جا رہا ہے۔ جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعہ اپنی مرضی کے انسان پیدا کیے جانے کی بات ہو رہی ہے۔ جن کی ذہانت اور عقل و شعور ڈرگس اور مشینوں کے تابع ہوں گے۔ سوچیے کیا ہو گا جب آپ کا امام و خطیب کوئی روبوٹ ہو گا۔ امامت اور مؤذنی، لیکچر اور تعلیم کے اعمال روبوٹ انجام دیا کریں گے!! اس میں تعجب کی بات نہیں کہ جرمنی میں کئی سال سے روبوٹ چرچ میں پادری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جاپان میں مردہ کی آخری رسومات ایک روبوٹک پروہت انجام دے رہا ہے!!

بایو سائنس سے پیدا شدہ ان سوالوں اور چیلنجوں سے زیادہ سابقہ یہودی اور عیسائی دینیات کو پڑ رہا ہے۔ مسلمان علما اور اہل فقہ بوجوہ ابھی اس سے دور ہیں لیکن بہر حال یہ اشکالات ان کے سامنے بھی آئیں گے۔ یہودی اور عیسائی مذہبی روایات نے ان چیلنجوں کا سامنا کس طرح کیا اس کی ایک جھلک مورل تھیولوجی کے ماہر پروفیسر مکینی اور پروفیسر جیسن اسپرنگ کی گفتگوؤں میں دکھائی دی۔ پروفیسر جیرالڈ مکینی پاکستان کے مشہور اسلامی اسکالر فضل الرحمان کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ مغربی دنیا میں اسلام پر سب سے قابل اعتبار اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اسکالر فضل الرحمان ہیں جو صدر ایوب کے زمانہ میں پاکستان میں ایک کلیدی عہدہ پر فائز کیے گئے تھے مگر قدامت پسندوں کی شدید مخالفت کی وجہ سے پھر وہ ملک چھوڑ گئے اور امریکہ چلے گئے تھے وہیں ان کی وفات ہوئی۔ راقم نے ادھر فضل الرحمان کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔

پروفیسر مکینی نے سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعہ آ رہے ان چیلنجوں کی تین تقسیمیں کیں۔

(۱) سائنسی عقلیت پسندی evidentialism جس میں ہر چیز کا محسوس ثبوت مانگا جاتا ہے اور تجربہ و تصدیق کے تجزیہ کا حق بھی لوگوں کو دیا جاتا ہے۔

(۲) انفرادیت پسندی Individualism یعنی فرد خود اپنی عقل کا استعمال کر کے معاشرتی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدود و قیود سے آزاد ہو خود فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو وہ دوسروں پر انحصار نہ کرے۔ وہ خود اپنی پسند ناپسند کا معیار طے کرے۔

(۳) مذہبی تکثیریت

مقرر نے بتایا کہ بائبل کے علمانے اس چیلنج کے جواب میں تین طرح کے رویوں کو ڈیولپ کیا: ا۔ معذرت خواہانہ رویہ کہ بائبل کو جدید دور کے مطابق سمجھا جائے اور اس کی تعبیر کی جائے۔ ۲: بائبل کا تاریخیت پر مبنی مطالعہ یعنی تاریخی شہادت اور درایت کو کام میں لاتے ہوئے بائبل کے ان نصوص کو مسترد کر دیا جائے جن کو تاریخ ثابت نہیں کرتی، اور بقیہ نصوص کی درایت پر مبنی تعبیر کرنا۔ ۳: یہ موقف کہ بائبل کی کہانیاں اصل میں تمثیل واستعارہ کی زبان میں انسانی تجربات کا بیان ہیں اس لیے ان کو As it is ماننا چاہیے، اس میں تاریخی ثبوت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ مؤخر الذکر رویہ کی ترجمانی پروفیسر ہنس فرائے اور پروفیسر میکنٹائر کرتے ہیں۔

جدید سائنس سے قبل پوری دنیا میں انسان کے نیچر کا وہی تصور رائج تھا جو ارسطو نے دیا تھا یہاں تک کہ مسلمان حکماء وفلاسفہ نے بھی اسی کی پیروی کی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وحی کے مقابلہ میں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا آدمی ارسطو ہے۔ آج کا مسئلہ یہ ہے کہ بایو سائنس کے ذریعہ کیا فطرت انسانی میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے؟ اس بارے میں مذہبی مسلمہ روایت (کیتھولک، اسلام اور یہودیت) یہ ہے کہ کائنات کا نیچر ایک بار بنا دیا گیا ہے (ارسطو اور سینٹ آگسٹائن یہی کہتے ہیں) اس لیے فطرت میں کوئی بھی تبدیلی تغییر خلق اللہ ہوگی۔ دوسرا موقف یہ ہے کہ تخلیق کا کام مکمل نہیں ہوا اور وہ جاری ہے اور انسان بھی اس میں حصہ لے رہا ہے اس لیے کائنات کے نیچر کو تبدیل کیا جاسکتا ہے اور اس پر تغییر خلق اللہ کی وعید کا اطلاق نہ ہوگا۔ (خیال رہے کہ بائبل کے بعض نصوص سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور قرآن بھی اسی کا قائل ہے جس کو اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ۔۔۔ کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

لیکچر میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ نان ہیومن agents کے ذریعہ بھی انسانی فطرت تبدیلی کو قبول کرتی ہے تاہم اگر انسانی فطرت میں ایسی تبدیلی لادی جائے کہ تمیز خوب وناخوب کا معیار ہی بدل جائے تو کیا ایسا کرنا چاہیے؟ اس سوال پر دینیات کے علما کو سوچنا چاہیے۔

سمر کیمپ میں کھیل کی اور صحت سے متعلق سہولیات فراہم کی گئی تھیں بعض طلبہ کھیلتے بھی تھے مگر ماحول اتنا مسحور کن تھا کہ زیادہ تر شام میں گھومنے اور ٹہلنے کو ترجیح دیتے۔ پاکستانی احباب فوٹو کھینچنے کے بڑے شائق نظر آئے حالانکہ ہندو پاک میں تصویر اور فوٹو کے معاملہ میں علما کے مابین جواز وعدم جواز کی بحث ابھی بھی چھڑی ہوئی ہے، تاہم فوٹو کلچر کے جنون نے کیا علما کیا غیر علما سب کو بری طرح متاثر کر ڈالا ہے۔

پروفیسر اطالیہ عمیر (اسرائیل) نے اپنے لیکچر میں وضاحت کی کہ ابراہیمی مذاہب یہودیت، مسیحیت



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسلام کے درمیان مذاکرات کے کیا امکانات ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ امریکہ میں عرب، مسلمان اور یہودی حقوق انسانی کے کارکنان کس طرح مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اور خود اسرائیل کے مظالم کے خلاف یہودی گروپ فلسطینیوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ اسرائیل کے خلاف مظاہرے کرتے، لٹریچر تقسیم کرتے اور رائے عامہ کو بیدار کرتے ہیں۔ یہودیوں، عربوں اور مسلمانوں کے مابین گہری ہوتی خلیج کے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ تاریخ میں دونوں قوموں کے مابین خوش گوار تعلقات رہے ہیں اور موجودہ کشیدگی ایک نیا ظاہرہ ہے جس کو اسرائیل کے قیام اور صہیونی تحریک سے زیادہ بڑھاوا ملا ہے۔ انہوں نے تحریک استشراق کا ذکر کرتے ہوئے معروف عرب اسکالر ایڈورڈ سعید کی استشراق پر تنقید کے حوالہ سے مستشرقین کے رجحانات اور مغربی استعمار کے لیے ان کی خدمات کا تذکرہ کیا۔

انٹینسِو کے آخری دو دنوں میں مولانا عمار خاں ناصر نے اپنے مخصوص اسلوب میں پورے sense of humor کو کام میں لاتے ہوئے شاطبیؒ، شاہ ولی اللہ اور شعرانی کی فکر کے حوالہ سے گفتگو کی جس کا عنوان تھا کہ انبیائی دعوت اور غیر انبیائی خطاب میں فرق۔ نئے مسائل کے جواب میں اس سلسلہ میں انہوں نے فکر اسلامی کی دو پوزیشنوں کا ذکر کیا۔ پہلی پوزیشن فقہاء کی ہے جو اسلام کے لیگل فریم ورک میں رہ کر کام کرتے ہیں اور اس کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ دوسری پوزیشن Historicism والوں کی ہے جن کے نمائندہ کے طور پر مولانا نے مولانا شاہ جعفر پھلواروی ندوی کی ایک کتاب مقام سنت کا حوالہ دیا۔ مقام سنت میں ندوی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ عبادات میں تعبد مطلوب ہے مگر معاملات میں تعبد اصل نہیں اس لیے اشکال بدل سکتی ہیں۔ مولانا عمار خاں نے فرمایا کہ تاریخیت کی اس پوزیشن پر کئی اشکالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب یہ لوگ لیگل فریم ورک میں نہیں دیتے۔ یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ موجودہ زمانہ تھیوری آف اجتہاد کیا ہوگی؟ عملی اصول پر مبنی علمیات کیا ہیں؟ شریعت اور متغیرات کے مابین کیا رشتہ ہے؟ مولانا عمار خاں صاحب نے جہاد اور اس کی نئی تفسیرات پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ جہاد کی جدید تشریحات نئے زمانہ اور جدید ذہن کو تو ایڈریس کرتی ہیں مگر وہ فقہاء اور کلاسیکل جہاد کی تعبیر کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتیں مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاعی ہے۔ پھر ان مہموں کا کیا جواز ہوگا جو نبی اکرم ﷺ نے یا خلافت راشدہ کے عہد میں روم و شام مصر اور ایران و عراق کے خلاف چھیڑی گئیں ان کو جہادِ دفاع کس اصول کے تحت ثابت کیا جائے گا؟

ایک مسئلہ یہ زیر بحث آیا کہ قرآن میں جو سائنسی معلومات ہیں وہ ضروری نہیں کہ Exact سمجھی جائیں بلکہ اس زمانہ کے ذہن کو سامنے رکھ کر قرآن نے اس انداز میں بات کہ دی کہ اس وقت کے مخاطب بات سمجھ جائیں۔ اسی طرح خرق عادت جو امور ہیں وہ شریعت کا موضوع نہیں بلکہ شریعت کا موضوع امور معتادہ ہیں۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ تفصیلات میں عرب کلچر کو گرچہ لیڈنگ کردار دیا گیا ہے مگر یہ مطلوب نہیں کہ دوسرے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشروں کے فروق، اعراف ومالوفات کو ختم کر دیا جائے۔

ایک سوال یہ اٹھا کہ اگر علل واسباب اور مصالح وحکم کے حوالہ سے اصول ہی بدل جائیں تو شریعت universal کیسے رہ پائے گی؟ یہ بھی پوچھا گیا کہ جب اس سے قبل کی شریعتیں مختلف رہی ہیں تو آج شریعت اسلامیہ کو فائنل کیوں کہا جاتا ہے؟ ایک سوال یہ آیا کہ اصل دین اور دین کے Contingent حصہ میں فرق کرنے کی وجہ وعلت کیا ہے؟ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ روایت کا احترام کرتے ہوئے ہر نئی generation کو خدا کی منشاء جاننے اور اس کے لیے کوشش کرنے کا حق ہے۔ جہاد اور غلبۂ دین اور آخری زمانہ کے بارے میں ظہورِ مہدی ویاجوج وماجوج کے حوالہ سے مولانا عمار ناصر صاحب نے علامہ انور شاہ کشمیری کی اس رائے کا ذکر کیا کہ اس سلسلہ کی احادیث سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ نہیں بلکہ ملک شام اور اطراف کا علاقہ مراد ہے۔ اسی طرح یاجوج وماجوج کا خروج ایک لمبا زمانی مرحلہ ہے۔ آج ترک (مسلمان) اور مغربی قومیں یاجوج وماجوج کی اولاد ہیں اور ہم انہیں کے زمانہ میں جی رہے ہیں۔

سمرانٹینسیو میں ۱۲ جولائی کو اسلامی فقہ اکیڈمی کے روح رواں مولانا امین عثمانی ندوی کا خطاب بھی ہوا جس میں انہوں نے ہندوستان میں فقہ، نئے مسائل اور اجتہاد کے سلسلہ میں اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے کیے گئے اپنے تجربات سے شرکاء کو آگاہ کیا۔ حالات کی نزاکت، نئے مسائل اور تحدیات کا ذکر کیا اور شرکاء کو اکیسوی N صدی کا عالم کیسا ہونا چاہیے اس پر غور وفکر اور تیاری کے لیے مہمیز کیا۔ ان کی گفتگو فکر انگیز، معلوماتی اور مؤثر رہی۔

سمرانٹینسیو کا مقصد صرف متعینہ موضوعات پر شرکاء کو لیکچر پلانا نہ تھا بلکہ مشرق کی عام روایت سے ہٹ کر ہر لیکچر کے بعد اور لیکچر کے دوران بھی طلبہ کو سوال وجواب کرنے کی بھرپور آزادی تھی۔ اس کے علاوہ روزانہ دوپہر کی نشست میں طلبہ کو ایک متعین سوال دیا جاتا، بعد ازاں شرکاء کے کئی گروپ بنا دیے جاتے، ہر گروپ میں ہندوستانی پاکستانی جنوبی افریقہ اور نوٹرے ڈیم ہر جگہ کے طلبہ کو رکھا جاتا۔ گروپ اس سوال پر باہمی ڈسکشن کے بعد کسی رائے تک پہنچتا یا اختلافِ رائے بھی رہتا پھر ہر گروپ سے ایک ایک نمائندہ انگریزی یا اردو میں گروپ کی بات پیش کرتا۔ پھر اس کے بعد لیکچرر اس پر تبصرہ کرتا۔ ہر روز اس کا بھی التزام کیا جاتا کہ طلبہ اپنا گروپ بدلتے رہیں تاکہ ہر طالب علم بحث ومباحثہ اور اظہار خیال کے اس عمل کا حصہ بن جائے۔ نیز کھانے کی میز اور چائے کے وقفوں میں بھی گفتگو اور سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ کہیں طلبہ پروفیسر ابراہیم موسیٰ کو گھیرے ہوتے کہیں وہ عمار ناصر صاحب سے بحث کر رہے ہوتے اور کہیں ڈاکٹر سعدیہ، جیسون اسپرینگ اور محمد یونس وغیر ہم سے بات ہو رہی ہوتی۔

صبح میں تو باہر نکلنے کا موقع کم ملتا چونکہ صبح کے وقت اکثر بارش ہو رہی ہوتی۔ مگر شام کو روزانہ بعض رفقاء کے ساتھ گھومنے کے لیے ضرور نکلتے، جن میں مفتی سعد مشتاق تو ضرور ہی ہوتے۔ کبھی پہاڑوں پر چڑھتے کبھی گہری کھائیوں میں اترتے۔ نہایت گہری کھائیوں اور اونچی چوٹیوں پر ہر کہیں لوگوں نے گھر بنا رکھے ہیں۔ ان میں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کئی لوگوں سے ملاقات اور بات چیت بھی ہوئی۔ نیپال میں عام طور پر ہندی بولی اور سمجھی جاتی ہے بعض نیپالی ہندو ہونے کے باوجود انڈیا سے ناراض نظر آئے کیونکہ ان کے بقول انڈیا کی پالیسیاں بڑے بھائی والی فراخدلانہ نہیں بلکہ بنیا گردی پر مبنی ہیں۔ بالمقابل انڈیا کے نیپالیوں کا جھکاؤ چین اور جاپان کی طرف زیادہ ہے۔ نیپالیوں میں مذہب کی طرف رجحان بہت کم ہے، مندر تو چھوٹے بڑے بہت ہیں اور بعض تاریخی بھی ہیں مگر اکثر غیر آباد ہیں۔ نیپال میں کئی سال پہلے جو زلزلہ آیا تھا اس نے کاٹھمانڈو اور اس کے مضافات کو زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ بعض تاریخی عمارات اور منادر و محلات وغیرہ کو preserve اور Rehabilitate کرنے کا کام اب جاپان اور چین کی بعض تنظیمیں یونیسکو کے ساتھ مل کر کر رہی ہیں۔ نیپالی زبان، لب ولہجہ اور رویہ میں بڑے نرم خو اور نرم مزاج ہیں۔ صحت اچھی، قد اکثر چھوٹا اور ناک چپٹی ہوتی ہے۔ فی الحال مغرب زدگی بہت ہے اس لیے بے پردگی عام ہے۔ غربت در و دیوار سے ٹپکتی ہے کیونکہ ملک قدرتی وسائل سے تقریباً تہی دست ہے اور زراعت بھی اس لیے نہیں ہے کہ پہاڑی ملک ہے۔ لے دے کر کاٹھمانڈو اور بعض دوسرے مقامات سیاحتی زمرہ میں آتے ہیں جو آمدن کا بڑا ذریعہ ہیں۔ کاٹھمانڈو اور مضافات میں گندگی نظر آئی، روشنی اور بجلی کا معقول نظم نہیں تھا ٹرانسپورٹ بھی اچھا نہیں۔ لیکن ایک چیز نیپال میں بہت خاص نظر آئی کہ کہیں مردوں یا عورتوں میں لڑائی جھگڑا تو تو میں میں حالت نہیں دکھائی دی نہ ہی کوئی آدمی کھلے میں کہیں پیشاب کرتا ہوا ملا۔

انٹینسِو کے درمیان دو جمعے پڑے تھے۔ پہلا جمعہ کاٹھمنڈو کی جامع مسجد میں پڑھا گیا جو ایک بڑی اور کشادہ مسجد ہے اس کے پاس ہی ایک کشمیری مسجد بھی ہے جس میں مزارات ہیں ان کو خاصا پر رونق بنا کر رکھا گیا ہے۔ یہ بریلوی حضرات کے زیر انتظام ہے۔ جامع مسجد جس میں ہم نے نماز پڑھی اس کے امام ایک ندوی فاضل ہیں انہوں نے عربی خطبے سے پہلے ایک چھوڑ دو دو تقریریں اردو میں کیں، بات تو عجیب سی لگی مگر حکمت شاید یہ تھی کہ بعد میں آنے والے نمازی بھی اردو خطاب سے مستفید ہو سکیں۔ نماز جمعہ کے بعد تاریخی منادر اور عمارتیں دیکھی گئیں اور پھر شاپنگ کی گئی۔ ڈنر ایک ہوٹل میں تھا جہاں سے قریباً نو بجے رات کو ڈھولی خیل رزارٹ کو واپسی ہوئی۔

کنواری دیوی: شہر کے شیو مندر میں ایک پرانی رسم یہ چلی آرہی ہے کہ کسی منتخب خاندان کی کمسن لڑکی کو مندر کے لیے خاص کر لیا جاتا ہے، اُس سے کوئی مل نہیں سکتا، کوئی بات نہیں کر سکتا، والدین بھی سال میں ایک آدھ بار ہی اس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ اس کو تعلیم بھی وہیں دلائی جاتی ہے۔ جیسا کہ قدیم ہند میں دیوداسی ہوا کرتی تھیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہ کنواری دیوی بلوغت تک ہی دیوی رہتی ہے، بالغ ہوتے ہی اس کا یہ منصب بھی ختم ہو جاتا ہے اور اس کو سرکاری اخراجات پر بیرون ملک اعلی تعلیم کے لیے بھیج دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری کم سن لڑکی کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔ کنواری دیوی ہفتہ میں ایک دن ۴ بجے دن کو آنے والوں کو بالاخانہ سے ایک جھلک دکھلاتی ہے جس میں فوٹو لینا ممنوع ہوتا ہے۔ روزانہ اُسے دیکھنے کے لیے آنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے، وہ کھڑکی میں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھڑی ہو کر ہجوم کی طرف جھانکتی اور پھر فوراً غائب ہو جاتی ہے۔ جس دن دن ہم وہاں پہنچے تھے اس کے نظر آنے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ لوگ دم بخود تھے اچانک ایک چھوٹی سی لڑکی کنگورہ میں نمودار ہوئی، اُسے دیکھ کر لوگوں میں ہلا گلا ہوا اور وہ فوراً ہی واپس ہو گئی۔ لوگوں کے ہجوم اور ان کے اشتیاق کو دیکھ کر یقین سا آ گیا کہ عام لوگوں کے لیے مذہب واقعی افیون ہی ہوتا ہے جس کی بنیاد پر ان سے کچھ بھی کروایا جا سکتا ہے۔

دوسرے جمعہ کو نماز کلاس ہال میں ہی پڑھی گئی۔ خطبہ اور امامت کے فرائض پروفیسر ماہان مرزا نے انجام دیے جو ایک نہایت متحرک، فعال اور پُرمزاح وشگفتہ انسان ہیں۔ ان کی باڈی لنگنویج اور پُرمزاح اسلوب تقریر نہایت دل کش ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ گہرے روحانی آدمی بھی ہیں۔ روزانہ شرکاء کو بڑی محبت سے Cosmos دکھاتے اور کلاسوں میں بھی اپنے interventions سے رہنمائی کرتے رہتے۔ جمعہ کی نماز کے بعد سیر کے لیے کاٹھمنڈو شہر کی طرف نکلے۔ پہلے پشوپتی ناتھ مندر گئے جس کے Sanctum Sanctorum کے دروازے غیر ہندوؤں کے لیے بند ہیں۔ باقی وسیع وعریض احاطہ میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کے کنارے چھوٹی سی ندی بہتی ہے جس کا نام بھاگ متی ہے۔ جگہ جگہ شمشان گھاٹ بنے ہوئے ہیں جن میں سے بعض پر لوگ چتا جلا رہے تھے۔ احاطہ میں چھوٹے چھوٹے بیسیوں مندروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ مین مندر کو چھوڑ کر بقیہ بوسیدہ اور غیر آراستہ ہے مگر دیکھنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔

وہاں سے نکل کر بودھ استوپا بودھاناتھ گئے جہاں پر ایک وسیع چبوترا اور گنبد بنا ہوا تھا اس کے احاطہ کا بودھ بھکشو اور شردھالو رات دن طواف کرتے ہیں۔ ساتھ ہی منتروں کا جاپ کرتے اور تسبیح پڑھتے جاتے ہیں۔ ساتھ کے کمرے میں بڑے بڑے گول ڈمرو بنے ہوئے تھے جن کو لوگ گھماتے ہیں یہ بھی ان دعا کا ایک حصہ ہے۔ استوپا دیکھنے کے بعد شاپنگ کی گئی اور مغرب بعد اسی بودھ استوپا کے ایک ریستوراں میں ڈنر کا اہتمام تھا۔ نو بجے رات کو واپسی ہوئی۔

ذہنوں میں مختلف نئے سوالوں کو اٹھاتا ہوا اور از سر نو غور وفکر پر آمادہ کرتا ہوا یہ انٹینسِو ۱۵ دن بعد خیر وخوبی سے ختم ہوا۔ آخری دن تمام شرکاء کے تاثرات سنے گئے۔ جس میں پہلے انڈیا کی ٹیم نے اظہار خیال کیا، اس کے بعد پاک شرکاء نے پھر جنوبی افریقہ اور پھر نوٹرے ڈیم کی طالبات نے۔ آخری ڈنر میں کلمات تشکر ادا کیے گئے اور اس کے بعد پروفیسر ابراہیم موسیٰ کا الوداعی خطاب ہوا۔

سمر انٹینسِو کی کامیابی دراصل اسی میں مضمر تھی کہ اس نے ذہنوں کو نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیا اور نئے نئے سوال مختلف حوالوں سے اٹھا دیے۔ نئے سوال اٹھانا اور ان پر غور وفکر کرنا ہی دراصل کسی قوم کے ارتقاء کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ مدرسہ ڈسکورس اپنے طلبہ کو سوال کرنے، نئے مباحث پر سوچنے اور ان کا جواب ڈھونڈنے کا فن سکھا رہا ہے یہی اس کورس کی خوبصورتی اور کامیابی ہے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھڑکی میں کھڑی ہو کر ہجوم کی طرف جھانکتی اور پھر فوراً غائب ہو جاتی ہے۔ جس دن دن ہم وہاں پہنچے تھے اس کے نظر آنے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ لوگ دم بخود تھے اچانک ایک چھوٹی سی لڑکی کنگورہ میں نمودار ہوئی، اُسے دیکھ کر لوگوں میں ہلا گلا ہوا اور وہ فوراً واپس ہو گئی۔ لوگوں کے ہجوم اور ان کے اشتیاق کو دیکھ کر یقین سا آ گیا کہ عام لوگوں کے لیے مذہب واقعی افیون ہی ہوتا ہے جس کی بنیاد پر ان سے کچھ بھی کروایا جا سکتا ہے۔

دوسرے جمعہ کو نماز کلاس ہال میں ہی پڑھی گئی۔ خطبہ اور امامت کے فرائض پروفیسر ماہان مرزا نے انجام دیے جو ایک نہایت متحرک، فعال اور پُر مزاح و شگفتہ انسان ہیں۔ ان کی باڈی لنگویج اور پُر مزاح اسلوب تقریر نہایت دل کش ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ گہرے روحانی آدمی بھی ہیں۔ روزانہ شرکاء کو بڑی محبت سے Cosmos دکھاتے اور کلاسوں میں بھی اپنے interventions سے رہنمائی کرتے رہتے۔ جمعہ کی نماز کے بعد سیر کے لیے کاٹھمنڈو شہر کی طرف نکلے۔ پہلے پشوپتی ناتھ مندر گئے جس کے Sanctum Sanctorum کے دروازے غیر ہندوؤں کے لیے بند ہیں۔ باقی وسیع و عریض احاطہ میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کے کنارے چھوٹی سی ندی بہتی ہے جس کا نام بھاگ متی ہے۔ جگہ جگہ شمشان گھاٹ بنے ہوئے ہیں جن میں سے بعض پر لوگ چتا جلا رہے تھے۔ احاطہ میں چھوٹے چھوٹے بیسیوں مندروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ مین مندر کو چھوڑ کر بقیہ بوسیدہ اور غیر آراستہ ہے مگر دیکھنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔

وہاں سے نکل کر بودھ استوپا بودھا ناتھ گئے جہاں پر ایک وسیع چبوترا اور گنبد بنا ہوا تھا اس کے احاطہ کا بودھ بھکشو اور شردھالو رات دن طواف کرتے ہیں۔ ساتھ ہی منتروں کا جاپ کرتے اور تسبیح پڑھتے جاتے ہیں۔ ساتھ کے کمرے میں بڑے بڑے گول ڈمرو بنے ہوئے تھے جن کو لوگ گھماتے ہیں یہ بھی ان دعا کا ایک حصہ ہے۔ استوپا دیکھنے کے بعد شاپنگ کی گئی اور مغرب بعد اسی بودھ استوپا کے ایک ریستوراں میں ڈنر کا اہتمام تھا۔ نو بجے رات کو واپسی ہوئی۔

ذہنوں میں مختلف نئے سوالوں کو اٹھاتا ہوا اور از سر نو غور و فکر پر آمادہ کرتا ہوا یہ انٹینسو ۱۵ دن بعد خیر و خوبی سے ختم ہوا۔ آخری دن تمام شرکاء کے تاثرات سنے گئے۔ جس میں پہلے انڈیا کی ٹیم نے اظہار خیال کیا، اس کے بعد پاک شرکاء نے پھر جنوبی افریقہ اور پھر نوترے ڈیم کی طالبات نے۔ آخری ڈنر میں کلمات تشکر ادا کیے گئے اور اس کے بعد پروفیسر ابراہیم موسیٰ کا الوداعی خطاب ہوا۔

سمر انٹینسو کی کامیابی دراصل اسی میں مضمر تھی کہ اس نے ذہنوں کو نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیا اور نئے نئے سوال مختلف حوالوں سے اٹھا دیے۔ نئے سوال اٹھانا اور ان پر غور و فکر کرنا ہی دراصل کسی قوم کے ارتقاء کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ مدرسہ ڈسکورس اپنے طلبہ کو سوال کرنے، نئے مباحث پر سوچنے اور ان کا جواب ڈھونڈنے کا فن سکھا رہا ہے یہی اس کورس کی خوبصورتی اور کامیابی ہے۔



© rasailojaraid.com